ورثائے اصل مالک زمین سے صرف ایک لڑکی نابالغہ ملی۔ ولی یا ولیہ جائز اس لڑکی کا کوئی موجود نہ تھا۔ سخت تردد ہوا۔

اس لڑکی کے ایک دور کے عزیز تھے۔ ان ہی کے قبضہ میں یہ لڑکی تھی۔ مرزا صاحب کو ایک نئی بات سوجھی کہ احمد علی کا عقد اس کے ساتھ کر دیا جائے۔ اس صورت میں وہ زمین اصل مالک زمین کے پاس رہے گی اور اس کی اجازت سے اعمالِ خیر اس پر صحیح ہو جائیں گے۔

جو صاحب اس لڑکی کے سرپرست تھے وہ نہایت ہی غریب آدمی تھے اور اس لڑکی کی بھی کوئی جائداد موجود نہ تھی مگر مرزا صاحب اپنے ارادے میں مستقل تھے۔ مرزا صاحب کے اکثر عزیزوں کی لڑکیاں موجود تھیں اور مرزا صاحب کی وجاہتِ ذاتی اب اس قسم کی تھی کہ اگر کسی امیر خاندان میں لڑکے کا پیغام دیتے تو وہ بخوشی منظور کر لیتا۔ اس بات میں میاں بیوی کی رائے میں بھی کسی قدر اختلاف ہوا تھا مگر وہ تو عجب طرح کی نیک بیوی تھیں۔ جب مرزا نے اپنا اصلی منشاء ان پر ظاہر کیا تو سمجھ گئیں۔ چپ ہو رہیں۔

واقعی ان میاں بیوی میں ویسا ہی میل تھا جو خاص منشائے تزویج ہے۔ جس مقصد کے پورا کرنے کے لیے اس صانع عالم نے عورت کو خلق کیا ہے نہ یہ کہ جب سے گھونگھٹ کھلا بلکہ اس سے بھی پہلے میاں سے مورچہ باندھ لیا۔ ساس سے صید ہو گئی۔ نندوں سے تو تو مَیں مَیں جوتی بیزار ہونے لگی۔ کبھی منہ پھولا ہے، کبھی ناک چڑھی ہے کہیں کوس رہی ہیں اور جو گالیوں پر زبان کھلی تو ہفتاد پشت میں کسی کو نہ چھوڑا۔ میاں بیوی کے باہمی معاملے میں ایک خاص بات اعتبار ہے۔ چاہیے کہ میاں کو بیوی پر

اور بیوی کو میاں پر اعتبار ہو۔ گھر کا کارخانہ چل ہی نہیں سکتا جب تک کہ ساکھ نہ ہو۔ نہ یہ کہ ادھر میاں نے کوئی بات کی اور ادھر بیوی نے کہا "چل جھوٹے" یا اگر بڑی تہذیب کی "اچھا یوں ہی ہو گا۔ پھر کسی کو کیا" اور باہمی اعتبار میاں بیوی دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ راست بازی اصل اصول ہے۔ ع راستی موجبِ رضائے خدا است

خدا ان ہی افعال سے راضی ہوتا ہے جن میں ہمارا تمہارا دنیا کا فائدہ ہے۔ ورنہ خدا ہمارے تمہارے بلکہ تمام عالم کے افعال سیئہ وحسنہ سے بے نیاز ہے۔ اصل ایمان اسی کا منشا ہے کہ اصلی معاشرت کے اصول ٹھیک مناسب ہوں۔ سب اس طرح مل جل کر رہیں کہ ہر شخص سے فائدہ پہنچے۔ بابِ مدینۃ العلم حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا: "مَاالکفر یَا اَمِیْرَالمُؤمِنِیْن" اے امیرالمومنین کفر کیا ہے۔؟ حضرت نے ارشاد فرمایا: "اشراک باللہ واضرار بالناس" یعنی خدا کی ذات میں کسی کو شریک کرنا اور آدمیوں کو ضرر پہنچانا۔ واقعی کیا جامع و مانع تعریف کفر کی ارشاد فرمائی ہے۔ ہر شخص جس کو کچھ بھی خدا کا خوف ہو "اضرار بالناس" سے بچتا رہے کہ اصل کفر ہے۔ زہد ریائی، خشک ملائی۔ غرضکہ ہر طرح کی خودنمائی اور خود آرائی اور باطن میں محض ہیچ بلکہ رات دن میں لوگوں کا مال غصب کرنے اور خلق اللہ کو ضرر پہنچانے کی فکر میں رہنا۔ ایسے لوگوں کا ایمان دار ہونا وہی بات ہے جیسے۔ ع برعکس نہند نامِ زنگی کافور، کم از کم میاں کو بیوی سے اور بیوی کو میاں سے ایسی معاملت رکھنا چاہیے کہ دونوں مل کر ایک ذاتِ واحد کے حکم میں ہو جائیں اور اس کے ساتھ ہی دونوں کو اپنے اپنے فرائض بھی سمجھ لینا چاہیے

یہ یاد رہے کہ حکیم مطلق کا کوئی فعل (معاذاللہ) عبث نہیں ہے۔ انسان اعلیٰ درجے کے مصنوعاتِ الٰہی میں سے ہے بلکہ مذہب اور حکمت اِس سے زیادہ کا دعویٰ کرتے ہیں اور انسان کو اشرف المخلوقات ٹھہراتے ہیں پھر اس کا خلق بوجہ اولیٰ عبث اور لغو نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہمیں اپنے افعال پر غور کرنا چاہیے کہ آیا ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس مقصود کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں، وہی کام ہم کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے تو حیف ہے۔ اب یہ کیونکر معلوم ہو کہ ہم کس کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ جن لوگوں کو عقلِ سلیم ہے وہ اپنے استعدادات اور قویٰ سے خود ہی اس مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ اس طرح سے کہ جب آنکھ کھول کر عالم کو دیکھتے ہیں اور اشیاء کے باہمی تعلقات پر نظر کرتے ہیں اور چیزوں کا تعلق اپنی ذات کے ساتھ اور اپنی ذات کا تعلق دوسری چیزوں کے ساتھ دیکھتے ہیں۔ اب ان چیزوں میں ذوی العقول اور غیر ذوی العقول دونوں شامل ہیں۔ ہمارے تعلقات دونوں سے ہیں اور جس سے از روئے جنسیت اور نوعیت کے تقارب بڑھتا جاتا ہے۔ اُس کی نسبت سے تعلقات بھی زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔

میاں بیوی کا تعلق بالکل انوکھا ہے۔ اس کو محدود کرنا سخت مشکل ہے مگر بعض حیثیتوں سے تمام تعلقات پر اس کو تفوق ہے۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ اکثر صورتوں میں یہ دونوں اپنے فرائض کو نہیں سمجھتے۔ اس سے طرح طرح کی خرابیاں واقع ہوتی ہیں۔

متاخرین میں سے ایک حکیم کا یہ خیال ہے کہ میاں بیوی دونوں کو خود مختار ہونا چاہیے۔ ہر واحد کے معاملات اور مال علیحدہ علیحدہ ہوں،

مثلاً میاں اگر کسی کارخانے میں کام کرتے ہیں تو بیوی ایک دفتر میں ملازم۔ مثلاً میاں پچاس روپے ماہوار پیدا کرتے ہیں تو بی بی سو روپیہ۔ دونوں اپنا اپنا کھاتے ہیں اپنا اپنا پہنتے ہیں۔ ایک دوسرے کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں نہ یہ آپ کے محتاج ہیں نہ وہ آپ کی۔ مگر دونوں میں محبت ہے۔ اس وجہ سے دونوں ایک ساتھ یا اکثر اوقات راحت یا تعطیل کے وقت ایک ساتھ رہتے ہیں۔ صرف اسی قدر تعلق ہے اور کچھ نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ عند الحاجت ایک دوسرے کی مدد کرنے کو موجود ہیں۔ مگر ہر واحد ان میں سے اس کی سعی کرتا ہے کہ اپنا بار کسی قسم کا کیوں نہ ہو دوسرے پر نہ ڈالیں۔

ہر ایک کی ان میں سے یہ کوشش ہے کہ جہاں تک ممکن ہو خواہ اپنی ذات پر تکلیف ہی کیوں نہ ہو دوسرے سے مدد نہ لیں بعینہٖ اسی طرح جیسے احباب میں ایک دوسرے سے مدد لینا عار سمجھا جاتا ہے خصوصاً معاملاتِ زر میں۔

اس حکیم نے جو صورت تزویج کی قرار دی ہے بیشک قابلِ غور ہے۔ اس امر پر دو حیثیتوں سے غور کرنا چاہیے۔ ایک تو یہ کہ ایسا ممکن ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ بالفرض امکان اس صورت میں فائدے کیا ہیں اور نقصان کیا ہیں۔

قطع نظر نقصان اور فائدوں کے اس میں ایک امر کی کمی ہے وہ یہ کہ استقرار اور تعینِ منزل کسی طرح ممکن نہیں۔ یعنی گھر نہیں بن سکتا۔ گھر کا مفہوم ایک ایسی چیز ہے جس کو الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ہر شخص کو جس کو خدا نے دنیا میں گھر دیا ہے وہ اس کو سمجھ سکتا ہے۔ یہ بعینہٖ ایسی بات ہے جیسے کوئی سرخ یا سبز کسی رنگ کی تعریف کرنا چاہے۔ یہ ایسی

چیزیں ہیں جن کا ادراک صرف مشاہدے پر موقوف ہے۔

اس حکیم نے جو صورت تجویز کی ہے اس میں مرد عورت دونوں اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ فرض کیا جائے کہ میاں مثلاً گھڑی سازی کی دکان کرتے ہیں۔ میاں ۸ بجے شب کو دکان بند کر کے گھر پر آتے ہیں اور بی بی ساڑھے پانچ بجے دفتر سے تشریف لاتی ہیں۔ امور خانہ داری سب ملازمین کے محول ہے (بشرطیکہ ملازم رکھنے کا مقدور بھی ہو) ملازمین نے کھانا پکا رکھا بچھونے بچھا دیے۔ دونوں میاں بیوی رات کو سو رہے۔ صبح کو کھانا وانا کھا کے دونوں صاحب پھر اپنے اپنے کام پر گئے۔

یہ زندگی چند روز تک بہت اچھی طرح گذر سکتی ہے لیکن فرض کیا جائے میاں یا بی بی دونوں میں سے کوئی بیمار ہو گیا اس صورت میں ضرور ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کریں۔ اگر بی بی بیمار ہوں تو میاں کو رخصت لینا ہوگی اور میاں بیمار ہوں تو بی بی کو اور اگر یہ نہ ہو تو ملک کی طرف سے کوئی ایسا انتظام ہو کہ بیماروں کی تیمار داری کسی خاص ہسپتال میں کی جائے۔ مثلاً اگر میاں بیمار ہوں تو چاہنے والی بی بی صرف اپنے دل ہی میں خالی میاں کی حالت پر افسوس کرتی رہیں۔ میاں کی تیمار داری ان لوگوں کے حوالے ہے جو ہسپتال سے قلیل تنخواہ پاتے ہیں۔ ایک تو میاں بیمار ہوئے۔ دوسرے پیاری بی بی سے چھوٹے۔ خدا ہی ان کی جان کا حافظ ہے۔

اگر یہ مرض مرض الموت ہو اور میاں نے انتقال کیا۔ اب بیوی اس فکر میں ہیں کہ میاں کی یادگار قائم کی جائے۔ چندے کی فہرست بنا کر اور بازو پر سیاہ کپڑا باندھ کر احباب سے چندہ تحصیلتی پھرتی ہیں۔ یہ ان لوگوں کی ہمت کا ذکر ہے جو کہ نامی اور نامور ہیں۔ ورنہ ۔ ۔ ۔ ۔ مرگئے مردود جن کا

فاتحہ نہ درود۔ بیوی نے تزویج کا معاہدہ کسی اور سے کر لیا۔

یہ تو اس صورت میں تھا کہ جب دو سے تیسرا نہ ہو۔ جیسا کہ حکیم موصوف کی رائے ہے کہ سلسلۂ توالد کو قطع یا محدود کرنا چاہیے یعنی اولاد نہ ہو یا ایک دو سے زائد نہ ہو۔ اس صورت میں یہ قاعدہ شاید مستحسن ہو لیکن حکیم موصوف کی رائے کے برخلاف اگر کسی بیوقوف مرد یا عورت کو اولاد کی ہوس ہوئی تو سخت مشکل پڑے گی۔ اسکے لیے بیوی کو وقتاً فوقتاً سِک لیو (رخصتِ بیماری) لینا پڑے گی اور اگر اس بیماری نے ترقی کی تو نوکری تشریف لے جائے گی اور اس صورت میں ایک امر اہم یہ ہے کہ معاملۂ معاشرت میں جب مرد اور عورت دونوں کا زور اور دونوں کے حق مساوی ہیں تو اولاد کی پرورش اور تربیت اور تعلیم کا بار کس کے ذمے ڈالا جائے۔ اس حالت میں یا تو (اسٹیٹ) سلطنت کی طرف سے لڑکوں کی پرورش کا بندوبست ہوگا اور اگر بر سبیل ترحم والدین نے خود اپنے ذمہ لے لیا۔ دونوں خدا کے فضل سے برسرکار ہیں۔ سوائے اس کے کہ ٹھیکہ پر دے دی جائے اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر ایک اولاد کو وہی لطف آئے گا جو حضرت آدم کو آیا ہوگا۔ باپ کی شفقت اور آغوشِ مادر کا لطف دونوں سے محروم رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ تمام انسان یہ سمجھنے لگیں گے کہ گویا وہ بذریعہ کلوں کے پیدا کیے گئے ہیں اور اصول میکانی کی بنا پر ان کی پرورش ہوئی ہے۔ اس حالت میں حقوقِ والدین کا حس و مس کسی اولاد کو باقی نہ رہے گا اور رفتہ رفتہ وہ حالت پیدا ہوگی کہ صاحبزادے بلند اقبال ہائی کورٹ کے جج ہیں اور والد ماجد خیرات خانے کے ٹکڑے توڑ رہے ہیں۔

مرزا صاحب کا مفہوم میاں بیوی کا یہ تھا کہ دونوں وجود اور بقائے

منزل کے لیے لازم و ملزوم ہیں اور دونوں کے جدا جدا فرائض ہیں۔

مرد کا فرض ہے منزل کے لیے ضروریات کا مہیا کرنا۔ عورت کا فرض ہے منزل کی اندرونی حالت کو درست رکھنا۔ یہ دونوں کے فرض ان دونوں لفظوں سے بہت اچھی طرح تعبیر کیے جا سکتے ہیں۔ مرد کا فرض۔۔۔۔ کمائی۔ عورت کا فرض۔۔۔۔ گرہستی۔ ان دونوں میں جس نے اپنا فرض ادا نہیں کیا وہ خدا کا بھی گناہگار ہے اور نظام معاشرت کا بھی اور اس گناہ کی دنیا میں یہ سزا ہونا چاہیے کہ ایسے مرد یا عورت کے حقوق منزلی ضبط کر لیے جائیں۔ نکھٹو میاں شوہریت کی لیاقت نہیں رکھتا اور پھوہڑ عورت اس قابل نہیں کہ وہ کسی شریف کی بی بی ہو سکے۔

سکینہ (اس لڑکی کا نام تھا جس کے ساتھ مرزا صاحب نے احمد علی کا عقد تجویز کیا تھا) کا سن دس گیارہ برس کا تھا۔ بھولی بھالی صورت تھی۔ ماں باپ دونوں ہی بچپنے کے زمانے میں مر چکے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد اس کو خالہ نے اپنی حمایت میں لے لیا تھا۔ وہ بھی قضائے الٰہی سے فوت ہو گئیں۔ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب سکینہ کا سن سات برس کا تھا۔ اب یہ لڑکی خالو کے پاس رہی۔ انھوں نے بھی زوجہ کے مرنے کے بعد عقد ثانی کیا۔ اس سے ناظرین بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ جس گھر میں رہتی تھی اس گھر کے مالکوں میں کسی کو سکینہ کے ساتھ کوئی طبعی تعلق نہ تھا۔ اس یتیم لڑکی کی پرورش ایک ترس خدا کا کام تھا۔ سکینہ کے خالو بیچارے بہت ہی غریب تھے۔ مرثیہ خوانی کرتے تھے۔ سال بھر کے بعد سو روپیہ ان کو ایک دیسی ریاست سے ملتے۔ اس پر چار اولادیں زوجۂ اولیٰ سے، ایک لڑکی زوجۂ ثانیہ سے۔ سکینہ کا نصیب اچھا تھا کہ مرزا صاحب کے دل میں اس کی محبت پیدا

ہوگئی مگر اس میں ایک مشکل یہ تھی کہ احمد علی کا سن پندرہ برس کا تھا۔ وہ ابھی مڈل کلاس میں پڑھتا تھا۔ مرزا کی یہ رائے تھی کہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد شادی کر دینا چاہیئے۔ مرزا بچپنے کی شادی کے خلاف تھے مگر جوان ہوتے ہی لڑکے لڑکی کی شادی کر دینے کو فرض سمجھتے تھے۔

مرزا نے سکینہ کے خالو سے مل کر اس کو اپنی سرپرستی میں لے لیا اور فرزندوں کی طرح پرورش کرنے لگے۔ سکینہ دبی دبائی لڑکی تھی۔ چند ہی روز میں مرزا صاحب کی بیوی نے اسے اپنے ڈھنگ پر لگا لیا۔ تین برس کے بعد احمد علی کے ساتھ عقد کر دیا گیا۔

جس طرح مرزا نے بہو کو تعلیم دی۔ بعینہٖ یہی خیال داماد کی نسبت تھا۔ مگر اس مطلب کے لیے انھوں نے کسی لڑکے کو پرورش نہیں کیا۔ اس میں یہ لم تھی کہ اگر ایسا کیا جائے گا تو صاحبزادے سسرال کے ٹکڑے توڑنے کے عادی ہو جائیں گے۔ ان سے پھر کوئی کام نہ ہوگا۔ لڑکی ایسے لڑکے سے نہ دبے گی۔ عمر بھر بے لطفی رہے گی مگر اب لڑکی بھی بیاہنے کے لائق ہو گئی ہے۔ آخر اپنے دوستوں میں سے ایک صاحب واحد حسین نامی تھے۔ انھوں نے شادی کا پیغام دیا۔ لڑکے کے چال چلن سے مرزا بخوبی واقف تھے۔ اس لیے کہ اگرچہ پہلے سے اس کا سان گمان بھی نہ تھا کہ اس لڑکے کے ساتھ لڑکی کا عقد کیا جائے گا۔ لیکن مرزا کو اپنے اور اپنے احباب کے لڑکوں کی تعلیم سے ایک قدرتی لگاؤ تھا۔ اس لیے مرزا اس لڑکے کی حالت سے بخوبی واقف تھے۔ پیغام آتے ہی مرزا نے منظور کیا۔ معمولی رسوم کے بعد شادی کر دی گئی۔ لڑکے لڑکی دونوں کی شادیوں میں مرزا صاحب نے خلافِ جمہور تمام بیہودہ رسموں کو ترک کر دیا۔ خاص احباب کی دعوت کے

سوا اور کسی قسم کا سامان نہیں کیا گیا۔ نہ رنڈیاں ناچیں۔ نہ بھانڈ بھگیتوں کو بلایا۔ لڑکے کی شادی میں تو دونوں طرف کا اختیار خود ان ہی کو تھا۔ سکینہ کے خالو برائے نام شریک ہو گئے تھے اور جو کچھ انھوں نے سکینہ کو اپنی خوشی سے دیا اس کو نہایت ہی شکر گزاری سے منظور کر لیا۔ لڑکی کی شادی میں یہ شرط پہلے ہی کر لی گئی تھی کہ مانجھا۔ ساچق۔ برات بطور متعارف نہ ہوگا۔ صرف شرعی عقد کیا جائے گا۔ دولھا کی ماں کو ڈومنیوں کے بلوانے پر بہت اصرار تھا مگر مرزا صاحب نے ہرگز منظور نہ کیا۔ شربت پلائی کی رسم کو مرزا بہت ہی برا جانتے تھے۔ اس لیے اکثر عزیزوں اور دوستوں سے بگڑ گئی۔ مگر مرزا ان لوگوں میں نہ تھے جن کو کسی امرِ معقول میں نظامِ معاشرت کی متابعت میں کوئی عذر نہیں ہے۔ اِلّا ان امور میں جو خلافِ خدا و رسولؐ یا خلافِ عقل ہوں۔ امورِ جائز میں ہم نظامِ معاشرت کی اسی طرح فرماں برداری کریں گے جس طرح سلطنت کے قانون کی یا تشریع کے احکام کی۔ مگر جو رسم اور قانون کے خلاف ہوگا۔ اس میں نظامِ معاشرت کا مقابلہ پوری قوت سے کیا جائے گا۔ لڑکے لڑکیوں کی شادیوں کے بعد مرزا بہت ہی سبکدوش ہو گئے۔ اب انھوں نے وہ طریقۂ زندگی اختیار کیا جس سے دنیا میں بہشت کا لطف آتا تھا۔ بشرطیکہ بہشت میں طبعی محنت بھی اسبابِ عیش میں داخل ہو۔ مرزا کا یہ خیال تھا کہ بغیر محنت کے زندگی بسر ہی نہیں ہو سکتی۔

اب انھوں نے لکھنؤ کے قریب ایک موضع میں ایک قطعہ زمین خود کاشت کیا۔ سال میں صرف دو ایک مہینہ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ باقی تمام سال، گویا وہیں گھر تھا۔ شہر میں مرزا کا دل نہ لگتا تھا اس لیے کہ یہاں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان مہیا نہ تھا۔ ان کے دو شغل تھے۔ ایک مشقت۔ دوسرے

کتب بینی۔ شہر کے لوگوں کو ان دونوں باتوں سے نفرت۔ ان کا خاص شغل جس سے مرزا کو نفرت کلی تھی۔ کبوتر بازی۔ بٹیر بازی تھی۔

اگرچہ بچپنے کے دوستوں کا اثر مرزا عابد حسین کی سیرت پر نہیں پڑا اور یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ وہ اس اثر کی خرابی سے محفوظ رہے لیکن عام نشوونما کے بعد البتہ اکثر قوی طبیعتوں نے ان پر اثر ڈالا اور اس کا انھیں ممنون ہونا چاہیئے۔

مثلاً سید جعفر حسین صاحب جن کو ان سے خاص محبت تھی۔ سید صاحب کی سیرت قوم اور ملک کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔ ابتدائی عمر سے سید صاحب کے قویٰ اس لائق نہ تھے کہ وہ کسی قسم کی سخت طبعی مشقت کر سکیں۔ اس لیے تعلیم انگریزی اعلیٰ درجے کی حاصل نہ کر سکے۔ صرف انٹرنس کلاس پہنچ کے بہ سبب علالت مدرسہ چھوڑنا پڑا۔ مگر مصلحت اندیش ذہن انسان کو ہرگز بیکار نہیں چھوڑتے۔ اس لیے انھوں نے رڑکی کالج کے داخلے کا امتحان پاس کیا اور اس مدرسے میں داخل ہو گئے۔ یہاں انھوں نے اپنی بالاستقلال محنت اور نیک چال چلن سے اپنے استادوں کو بہت ہی خوش رکھا۔ اگرچہ اس مدرسے میں ایک صاحب اور بھی لکھنؤ کے رہنے والے اس زمانے میں داخل تھے اور سید صاحب اور وہ بوجہ ہموطن ہونے کے ایک ہی بارک بلکہ ایک ہی کمرے میں مقیم تھے۔ یہ دوسرے حضرت انتہا کے کاہل، فضول خرچ اور سب سے بڑا خبط شاعری کا ان کے دماغ میں سمایا ہوا تھا۔ رڑکی کالج میں داخل ہو کر بجائے اس کے کہ وہ تعلیمی کورس کو یاد کرتے۔ غالب اور ذوق کے دیوان حفظ فرماتے تھے۔ سرِ شام

سے آدھی رات بلکہ اس سے کچھ زیادہ دیر تک اپنا اور اپنے ساتھیوں کا وقت ضائع کرنے کے سوا ان کو کوئی اور کام نہ تھا۔ صبح کو ماشاء اللہ اس وقت سو کے اٹھتے تھے جس وقت کالج کا گھنٹہ بجتا تھا۔ یعنی ساڑھے دس بجے۔ پھر اس وقت بھی اگر ان کا شاہانہ مزاج درست ہوا تو کالج گئے ورنہ بارک ہی میں پڑے رہے۔ ماہواری امتحانوں میں کتابیں دیکھنا قسم تھا صرف امتحان سے ایک دن پہلے جب طلباء آپس میں بیٹھ کر مباحثہ کیا کرتے تھے۔ اس میں خوفِ خدا کر کے شریک ہو جاتے تھے۔ مگر نہیں معلوم کیا خدا کی قدرت تھی کہ کسی امتحان میں فیل نہ ہوئے۔ صرف پاس ہونے بھر کے مارکس (نمبر) مل جایا کرتے تھے۔ حضرت کو اس کا فخر تھا۔ سالانہ امتحان میں خدا خدا کر کے پاس ہو گئے اور ایک سال کے لیے سید صاحب کو اپنے حال پر چھوڑ کے کالج سے نکل آئے۔ نوکری پر بھی ایشیائی شاعری کا زہریلا اثر اور ان کے ملزوم کاہلی، بے پروائی، بد دماغی کو لیے ہوئے پہنچے۔ بھلا ایسوں سے نوکری کیا ہوتی۔ ڈیڑھ دو برس کے بعد موقوف کر دیے گئے۔ پھر مستقل سرکاری ملازمت نہ ملی۔ خدا جانے کس طرح ہیں اور کیونکر ہیں۔ ان حضرت کے کالج سے نکل آنے کے بعد سید صاحب کا پیچھا چھوٹا۔ اب سید صاحب نے مستقل محنت کرنا شروع کی۔ دوسرے سال کے امتحان میں (جو رڑکی کالج کا آخری امتحان ہے) دوسرے درجہ میں پاس ہوئے اور ایک مضمون میں انعام بھی پایا۔ اس کے بعد محکمۂ نہر میں ملازم ہوئے اور اس محکمہ میں اب بھی اعلیٰ درجے کے عہدے پر ہیں۔ میں پہلے ایک مقام پر لکھ چکا ہوں کہ مرزا عابد حسین نے انجینیری کا امتحان آپ ہی کی رائے سے پاس کیا تھا۔ بلکہ اس امتحان کے پاس کرنے میں آپ نے بڑی مدد کی۔ پیمایش ولیول، نقشہ کشی،

تخمینہ عمارات وغیرہ سب آپ ہی سے سیکھا تھا۔

سید صاحب کو ان کے ساتھ اور ان کو سید صاحب کے ساتھ خاص درجے کا خلوص تھا۔ وہ آپ کی مدح وثنا غائبانہ کیا کرتے تھے اور یہ ان کی تقلید کرتے تھے اور وہ ان کی۔ مذاق دونوں کا ملتا تھا۔ شعروشاعری سے ان کو بھی نفرت تھی اور انھیں بھی۔ سمجھتے دونوں تھے۔ مگر واقعیت میں اس قدر غرق تھے کہ مضامینِ خیالی ان کو ہیچ و پوچ معلوم ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے۔ سید جعفر حسین صاحب کے وہی لکھنوی ہموطن جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ فصیح الملک نواب مرزا صاحب داغ دہلوی کا تیسرا دیوان بڑے ذوق وشوق سے خرید کر لائے۔ سید صاحب اس وقت موجود تھے۔ خدا جانے کیا جی میں آیا۔ دیوان اٹھا کے دیکھنا شروع کیا۔ اتفاق سے پنسل ہاتھ میں۔ اشعار نظری کرنا شروع کر دیے۔ صفحہ کے صفحہ کاٹ دیے اور بعض اشعار پر کچھ حاشیے بھی چڑھائے۔ بس یہی مذاق بعینہٖ مرزا عابد حسین صاحب کا بھی تھا۔ میکانکس میں دونوں کو اعلیٰ درجہ کی قابلیت تھی۔ میکڑوں کلوں کی تجویزیں روزانہ ہوا کرتی تھیں۔ نقشے بنا کرتے تھے بلکہ اگر مقدور ہوا تو اس کے نمونے بھی بنوائے گئے۔ ورنہ آرزوئیں دلوں میں رہ گئیں۔

مرزا عابد حسین کے عزیزوں میں سے بھی کوئی ایسا موجود نہ تھا جس سے مرزا عابد حسین کے اخلاق کو کوئی نفع پہنچا ہو۔ ان کے ایک عزیز کا تذکرہ یہاں بطور نمونے کے کیا جاتا ہے۔

مرزا عابد حسین کے دور کے رشتہ داروں میں ایک شخص مرزا فدا حسین

نامی لکھنؤ کے رہنے والے بہت تباہ حال اور پریشان تھے۔ کسی قدر فارسی پڑھے ہوئے تھے اور بچپنے سے شعر گوئی کا بھی خبط تھا۔ اس نے طبیعت کو اور نازک کر دیا تھا۔ مرثیہ خوانی کے شوق نے صبر و قناعت کا سبق پڑھا دیا تھا۔ سال بھر کے بعد عشرہ محرم میں کسی سرکار سے صرف پچیس روپے کی آمد تھی۔ اس میں کیا ہوتا تھا۔ ایک بی بی۔ ایک آپ۔ ایک لڑکا۔ دو لڑکیاں تھیں۔ غرض کہ یہ سب بندے خدا کے افلاس کے پنجے میں گرفتار تھے۔ نہ کوئی صورت مفر کی آپ سے آپ نظر آتی تھی کہ اس بلا سے نجات حاصل ہو اور نہ اتنی ہمت اور عقل تھی کہ خود اپنی سعیِ بازو سے مخلصی حاصل کریں۔ جو لوگ لکھنؤ کے نظامِ معاشرت سے واقف ہیں ان سے تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مگر ہاں اور لوگوں کو اتنا بتانا ضرور ہے کہ یہاں کے رہنے والے عموماً عقلِ معاش سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ شہر اب ایسا مفلس ہو گیا ہے کہ یہاں کے متوسط درجے کے لوگوں میں سے اکثر کو آپ فکرِ معاش میں مبتلا پائیے گا اور اگر کسی چلتے پرزے آفت کے پرکالے کو عقلِ معاش ہے بھی تو وہ عقلِ فساد کے ساتھ ملی ہوئی۔ نیک اور جائز وسیلوں سے روپیہ پیدا کرنا یہاں کے لوگ ناممکن خیال کرتے ہیں اور دنیا بھر میں روپیہ پیدا کرنے کے لیے طرح طرح کی تدبیریں سوچی جاتی ہیں۔ کوئی اس فکر میں ہے کہ یا کوئی پیشہ سیکھیں یا کوئی نوکری کریں۔ یا اگر کسی قدر راس المال پاس ہے تو کوئی دوکان کھولیں یا کوئی کارخانہ کریں۔ یہاں اس قسم کی کوشش کرنے والے پست خیال، ادنیٰ درجے کے لوگ، چھوٹی امت والے سمجھے جاتے ہیں اور جو شخص ایسا کر لیتا ہے وہ گویا دائرۂ تشخص سے نکل جاتا ہے۔ مثلاً ان لوگوں میں جو اہلِ تشخص میں داخل ہیں (یہ وہی لوگ ہیں جن کے آباؤ اجداد صاحبِ ثروت تھے۔ یہ بزرگ ثروت کو تو

اپنے ساتھ ملک عدم کو لیتے گئے۔ مگر محض تشخص اور نخوت جو کہ لازمی صفات اس ثروت کے تھے، اپنی اولاد کی میراث میں چھوڑ گئے۔ اگر کسی نے کوئی پیشہ کر لیا تو وہ بیچارہ انگشت نما ہو جاتا ہے۔ پھر کیا کریں؟ یہ مجھ سے سنیے:۔

۱۔ اگر عربی شُدبُد پڑھی ہے اور شکیاتِ نماز اور مسائلِ روزمرہ سے واقف ہے کسی مجتہد سے بہ سعی و سفارش یا بہ اظہار رسوخیت خاندانی اجازت حاصل کر کے پیش نماز بن جائے۔ لکھنؤ میں تو خیر مگر اکثر باہر کے دیہاتی قصباتی بہت سے معتقد ہو جائیں گے۔

۲۔ اگر چوگوشیہ ٹوپی قالب پر چڑھانا جانتا ہے۔ کسی نامی مرثیہ خواں کا شاگرد ہو جائے اور ان سے کوئی رقعہ لے کر باہر چلا جائے حسب حیثیت لباس و تشخص ظاہری کچھ نہ کچھ وصول ہو جائے گا۔

۳۔ اگر کچھ پڑھا نہیں ہے۔ صرف کسی قدر قرات سے واقف ہے۔ خصوصاً ذال اور ضاد کو بہ صحت ادا کر سکتا ہے کسی میت کے روزہ نماز کا اجورہ لے۔ نماز پڑھے یا نہ پڑھے۔ روزے رکھے یا نہ رکھے۔ یہ اس کا ایمان جانے یا حج یا زیارت کا معاملہ کرلے۔

۴۔ اگر علم مجلس سے واقف ہو کسی رئیس کا دربار کرے۔ نوکری کا امیدوار رہے۔ وقتاً فوقتاً بغرض فاقہ شکنی کے کچھ وصول ہو جایا کرے گا۔

یہ صورتیں اکلِ حلال کی ہیں۔ اب اگر حرام و حلال سے کوئی بحث نہ رکھتا ہو اور صورت ظاہری اچھی ہو کسی مالدار عورت کے پھانسنے کی فکر کرے عام اس سے کہ وہ شوہر دار ہو یا بیوہ۔ یہ بھی ناممکن ہو تو کسی نو عمر رئیس زادے کو قبضے میں لائے۔ اس حالت میں اگر ممکن ہو تو اپنی بہن یا لڑکی کا نکاح اس کے ساتھ کر دے یا کسی اور طریقہ سے اس کے تمام مال پہ قبضہ کرے اور جب وہ

یک بینی و دو گوش ہو جائے تو اس سے کنارہ کشی کرے اور تنہا اس کی لیاقت نہ رکھتا ہو تو جعلیوں کی کمپنی میں شرکت کرے اور جو کچھ روپیہ پاس ہو تو جعلی مقدموں میں روپے سے مدد دے۔ روپیہ نہ ہو تو پیروی دوڑ دھوپ سے اپنا ایک حصہ مستقل کمپنی میں قائم کرے۔

یہ سب صورتیں ایسی ہیں کہ نظامِ معاشرت میں عزت باقی رہے اور روپیہ پیدا ہو، اور اگر کوئی خدانخواستہ کوئی پیشہ کر لیا یا کسی قسم کا ہنر سیکھ کے اس سے اخذِ معاش کرنے لگا تو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہو جائے گا یہاں تک کہ لڑکے لڑکی کی شادی بیاہ میں دقتیں پیش آئیں گی۔ چھوٹی امت والوں میں شمار کر لیا جائے گا۔ خواہ وہ کیسا ہی شریف النسل اور شریف الذات کیوں نہ ہو۔ یہ امور جو یہاں لکھے گئے ہیں۔ اس کو ناظرین مذاق نہ سمجھیں۔ یہ بالکل واقعات ہیں۔

غرض کہ ہمارے مرزا صاحب کے عزیز مرزا فدا حسین اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے جن کے ایسے خیالات ہوتے تھے اور اپنے خیالات کے بدولت یہ اور ان کے بال بچے طرح طرح کے مصائب میں مبتلا تھے۔

جس زمانہ میں مرزا صاحب ضلع میرٹھ میں اسسٹنٹ انجینیر تھے۔ مرزا فدا حسین بصیغۂ مرثیہ خوانی اسی ضلع میں ایک رئیس کے مکان پر تشریف لے گئے۔ مرزا صاحب بھی محرم کی مجلسوں میں وہاں جایا کرتے تھے۔ وہیں ملاقات ہوئی۔ مرزا فدا حسین کو بلحاظ قرابت ایک دن اپنے علاقہ پر مہمان کیا۔ دعوت کی۔ ایک روز خود اپنے مکان پر مجلس کر کے مرزا صاحب سے پڑھوایا۔ وقت روانگی مرزا صاحب کو رئیس کی سرکار سے پچیس روپے وصول ہوئے۔ مرزا فدا حسین کے افلاس کا حال کچھ پوشیدہ نہ تھا۔ مرزا عابد حسین نے ایک مجلس

کی پڑھوائی کے حیلے سے پچاس روپے اپنے پاس سے دیے۔ دوسرے سال پھر ایسا ہی اتفاق ہوا۔ اب کی مرتبہ مرزا فدا حسین نے کہا کہ اگر کوئی صورت روزگار کی ممکن ہو تو کر دیجیے۔ مرزا عابد حسین نے کہا کہ صورت روزگار کی ہو سکتی ہے بشرطیکہ محنت پر آمادہ ہوں۔ مرزا فدا حسین افلاس کے ہاتھوں بہت تنگ تھے منظور کر لیا۔ مرزا عابد حسین نے صاحب سے کہہ کے ایک جگہ محرری کی ان کو دلوا دی۔ پندرہ روپے ماہوار تنخواہ تھی۔ مرزا فدا حسین خوشی خوشی لکھنؤ گئے اور مع اہل و عیال مرزا عابد حسین کے علاقہ پر پہنچ گئے۔

مرزا عابد حسین نے ان کے اہل و عیال کو اپنے گھر میں اتار لیا۔

مرزا فدا حسین کی بیوی سکینہ بیگم بہت ہی تنگ مزاج تھیں۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے طرز معاشرت کی عادی۔ عادتیں بگڑی ہوئیں۔ صبح کے نو بجے سو کے اٹھنا۔ دن بھر فضول اوقات ضائع کرنا۔ ویسی ہی کچھ بچوں کی بھی خصلتیں تھیں۔

ان لوگوں کو کبھی باہر جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ ہر چیز باہر کی آپ کو بُری معلوم ہوتی تھی۔ خواہ وہ درحقیقت بری ہو یا نہ ہو۔

مرزا فدا حسین کا خیال کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ان کی بیوی یہ سمجھتی تھیں کہ مرزا عابد حسین نے جو ان کے میاں کو نوکر رکھوا دیا ہے اس میں کچھ ان ہی کا مطلب ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی مہمان نوازی کے لحاظ سے جتنی ان کی خاطر داری کرتی تھیں وہ اس کو ایک قسم کی خوشامد اور مطلب برآری سمجھتی تھیں۔ یہ تو ایک قسم کی غلط فہمی تھی۔ اس کے علاوہ حسد نے اور بھی آنکھوں پر پردے ڈال دیے تھے۔ احسان فراموشی عیب ہے مگر وہ اپنے شوہر کو مرزا عابد حسین کا محسن تصور کرتی تھیں اور اسی قسم کے سلوک کی متوقع تھیں جو محسنوں کے ساتھ

کرنا چاہیے۔ سکینہ بیگم صاحبہ نے ایسے حلقۂ معاشرت میں پرورش پائی تھی جہاں بے غرضی سے کسی کے ساتھ نیکی کرنے کا مفہوم بالکل ناممکن خیال کیا جاتا تھا۔ ان کا یہ مقولہ تھا کہ "بے مطلب کسی کو کوئی کچھ نہیں دیتا۔"

مرزا فدا حسین کی بیوی یہ سمجھتی تھیں کہ مرزا عابد حسین اور ان کے خاندان نے ان کے شوہر اور خود ان پر وہ ظلم کیا ہے جس کی تلافی رقمِ مظالم سے بھی ممکن نہیں۔ ایک تو لکھنؤ سے چھڑوانے کا گناہ اس قدر سنگین اور سخت تھا کہ اگر عدالت مرزا فدا حسین کی بیوی کے اختیار میں ہوتی تو مرزا عابد حسین اور ان کے بی بی بچوں کو کولھو میں پلوا ڈالتیں۔ اٹھتے بیٹھتے یہ کلام تھا۔ ہائے پندرہ روپلّی کے لیے گھر چھوٹا، بار چھوٹا۔ موئے جنگلے میں آ کے رہنا پڑا۔ کیوں بہن رقیہ بیگم (مرزا عابد حسین کی بیوی کا نام) میں کہتی ہوں اگر یہاں کوئی مر جائے تو کیا ہو؟ کھٹیا پر اٹھایا جائے گا۔ فاتحہ درود بھی اچھی طرح نہ ہو۔

تمہارے میاں کا خدا بھلا کرے کس جنگل میں لا کے ڈالا ہے جہاں اپنا کوئی عزیز نہ ساتھی۔ نہ پوچھنے والا، نہ دیکھنے والا۔ سب تو سب میری بتولی کو دوسرا سال بھر کے تیسرا سال شروع ہو گیا ہے۔ شہر میں دودھ بڑھائی کرتی۔ چار اپنے پرلئے جمع ہوتے۔ نذر نیاز ہوتی۔ ذاکر (بڑے لڑکے کا نام تھا) کو پندرھواں سال ہے۔ ماشاءاللہ مسیں بھیگتی ہیں۔ اس کا سیل کونڈا کرنا ہے۔ اور تو خیر۔ بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ ہرمزی (بڑی لڑکی کا نام ہے) کو نواں برس ہے۔ شہر میں ہوتے تو اس کی نسبت کا بندوبست کرتی۔ مشاطہ کو بلوا کے کہیں سے رقعہ منگواتی۔ میں کہتی ہوں کہ یہ ہونا کیا ہے۔ پھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ باز آئے ہم اس پندرہ روپیہ کی نوکری سے۔ شہر کے چنے اچھے اور باہر کا پلاؤ نہیں اچھا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی بہت ہی نیک اور نمو ہی تھیں مگر پندرہ روپے کا طعنہ اتنی بار دیا گیا کہ آخر کلیجہ پک گیا۔ ایک آدھ مرتبہ بولنا ہی پڑا۔ ان کا بولنا تھا کہ اچھی خاصی لڑائی ٹھن گئی۔ بی سکینہ بیگم آپ ہی آپ خفا ہو گئیں۔ بات چیت ترک کر دی۔ عادتیں اس خاندان کی بالکل بگڑی تھیں۔ سب سے بڑھ کر ایک خراب عادت سوا پہر دن چڑھے سو کے اٹھنا۔ نماز، دعا سے کوئی واقف ہی نہ تھا۔ مرزا عابد حسین کی بیوی منھ اندھیرے سو کے اٹھتی تھیں۔ اور اپنے ساتھ بیٹی بہو کو بھی اٹھا کے نماز پڑھواتی تھیں۔ اس کے بعد کلام اللہ کا ایک سپارہ پڑھا جاتا تھا۔ مامائیں۔ اصیلیں کھانا پکاتی تھیں۔ بیویاں یا کتابیں پڑھ رہی ہیں یا کچھ سی پرو رہی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ مرزا عابد حسین کی جفاکشی اور محنت پسندی کا تمام گھر پر اثر تھا۔ چھوٹا بڑا اس خاندان کا بیکاری کو گناہِ عظیم سمجھتا تھا۔ "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" یعنی اچھے کاموں کے کرنے کی ہدایت کرنا اور بری باتوں سے روکنا نہ صرف ایک فرضِ مذہبی ہے بلکہ انسان کی نیکی خود اسے کاموں کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ اگر طبیعتیں برائیوں کی عادی نہ ہو جائیں اور ان میں تربیت پذیری کا جوہر موجود ہوتا ہے تو اصلاح ممکن ہے۔ جن طبیعتوں میں خراب عادتیں جڑ پکڑ لیتی ہیں تو ان میں بجائے تربیت پذیری کے ایک قسم کی ضد کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کا دل بھی اپنی برائی کا معترف ہوتا ہے مگر اس کے ترک پر یا تو قدرت نہیں رکھتے یا اسے محال سمجھتے ہیں۔ اس لیے طبیعت ان حیلوں کو تلاش کرنے لگتی ہے جن سے نصیحت گروں کی زبان بندی کی جائے یا اگر اوروں کو نیکی کرتے ہوئے دیکھ کے خود اپنا نفس ملامت کرے تو اس میں جوہرِ شریف کو (جو فی الحقیقت ایک فرشتہ ہے جو ہر حالت اور ہر وقت میں انسان کو نیکیوں کی ترغیب اور برائیوں سے منع کیا کرتا ہے اور جب

اس کا کہنا نہ مان کے انسان برائی کرتا ہے تو اس کو سخت ملامت کرتا ہے) دبا دینے بلکہ خاک میں ملا دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مثلاً جب مرزا عابد حسین کی بیوی نے دیکھا کہ کئی وقت نماز کے گذر گئے اور مرزا فدا حسین کی بیوی نے نماز نہ پڑھی تو پہلے ان کو تعجب سا ہوا۔ دو ایک مرتبہ ارادہ کیا کہ کچھ کہیں لیکن لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکیں۔ آخر ایک دن مرزا فدا حسین کی بیوی کو علیحدہ لے جا کے اس طرح تمہید اٹھائی۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ بھابی مجھے ایک بات میں بڑا تعجب ہے مگر کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو کہوں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ کہو۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ کہنا یہ ہے کہ میں نے آپ کو نماز پڑھتے نہیں دیکھا اور نہ لڑکوں کو۔ یہ آپ لوگ نماز کس وقت اور کہاں پڑھتے ہیں کہ مجھ کو خبر نہیں ہوتی۔ بھائی صاحب کی اذان اور نماز کی آواز اکثر آتی ہے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ ہاں وہ پڑھتے ہیں شاید۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ ہائیں! یہ شاید کیسا اور کیا آپ نہیں پڑھتیں؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ رمضان اور محرم میں تو پانچوں وقت کی نماز پڑھتے ہیں۔ اور یوں کبھی پڑھ لی اور کبھی نہ پڑھی۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ تو کیا فقط محرم اور رمضان میں نماز واجب ہے اور دنوں میں نہیں؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :۔ اب یہ تو مولوی لوگ جانیں جو میں نے دیکھا تھا تم سے کہہ دیا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :۔ اچھا آپ کیوں نہیں پڑھتیں؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :- یہ بھی ایک کم بختی کی مار ہے۔ بات اتنی ہے کہ میری طبیعت میں شبہہ کچھ اس قسم کا ہے کہ جہاں ذرا سی چھینٹ پڑ گئی یا کچھ ایسی بات ہو گئی۔ بس جی نہیں چاہتا نماز پڑھنے کو ؟

مرزا عابد حسین کی بیوی :- شبہہ تو آپ جانتی ہیں موئے شیطان کی طرف سے ہوتا ہے۔ شیطانی وسوسے کے خیال سے خدا کی نماز کا چھوڑنا کیسا ؟

مرزا فدا حسین کی بیوی :- اے ہے بھابی تم تو پڑھی لکھی ہو۔ تم سے دلیلیں کون ملائے۔ اچھا اب کی سے نہاؤں گی تو ضرور پڑھوں گی۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :- جان بوجھ کے ایک مرتبہ کی نماز قضا کرنے کا نہیں معلوم کتنا عذاب ہے اور آپ نے کہہ دیا کہ نہاؤں گی تو پڑھوں گی۔ ابھی پرسوں تو آپ نہائی تھیں۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :- اے ہے نہائی تو تھی پھر چھینٹ پڑ لئی۔ کپڑے غارت ہو گئے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :- کہاں چھینٹ پڑ گئی۔ جہاں چھینٹ پڑ گئی ہو اس کو دھو کے غوطہ دے لیجیے۔ شوق سے نماز پڑھیے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :- اب یہ کیا معلوم کہاں چھینٹ پڑ گئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر کیا تھا۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :- تو معلوم ہوتا ہے آپ نے چھینٹ پڑتے دیکھا نہیں۔ اگر دیکھا ہوتا تو یہ ضرور معلوم ہوتا کہ کہاں پر چھینٹ پڑی۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :- ہاں تو میں خود ہی کہتی ہوں کہ شبہہ ہے۔

مرزا عابد حسین کی بیوی :- شبہہ پر نماز ترک نہیں ہو سکتی۔

مرزا فدا حسین کی بیوی :- خدا مارے یا جلائے۔ مجھ سے تو ہرگز نہیں نہایا جاتا۔